

از گریۂ من ہر طرف، پُر لالہ و گُل شُد زمیں
وقتِ بہ گلگشت اے صنم، در گلستانِ من بیا

خسرو

انکسار

مظفّر ایرج

شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۳

شاعر: مظفّر ایرج

پتہ: 'کہکشاں'، نوگام، نٹی پورہ، سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۱۵

پہلا مجموعہ: ابجد

سالِ اشاعت: ۱۹۸۳ء

دوسرا مجموعہ: انکسار

پہلی بار: دسمبر ۱۹۸۸ء

تعداد: ایک ہزار

انتخاب: مظہر امام

ترتیب واہتمام: قمر احسن

خوشنویس: ممتاز رقم

مطبوعہ: کریسنٹ پرنٹنگ ورکس (پرائیوٹ) لمیٹڈ۔ دہلی

قیمت: پچاس روپے

ناشر: شب خون، کتاب گھر، الہ آباد ۳

تقسیم کار:

- شب خون، کتاب گھر، الہ آباد
- نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ
- "انکار" جیل روڈ، علی گڑھ
- جی کے انٹرنیشنل بنگلور
- جے کے بک ہاؤس جموّں

تیرے نام

کہ

تو نے مجھے سدا

اپنی بے انتہا رحمتوں اور نوازشوں سے

سرافراز کیا

میں آخر

تیری

کون کون سی نعمت سے انکار کروں ○

اپنی چھوٹی بیٹی

آمنہ غزل کی نذر

کہ میری ہر تخلیق کی

پہلی سامع بھی ہے، قاری بھی اور ناقد بھی

ترتیب

غزلیں۔ آزاد غزلیں

خلاءٗ افلاک کیا ہیں ! کیا زمیں ہے
کہ میرے ربّ تو ربّ العالمیں ہے

ترا پَرتو جہانِ رنگ و بُو میں
نہاں ہو کر بھی ہر شئے میں مکیں ہے

معلّق چرخ ، سورج ، چاند ، تارے
تری قدرت میں قادر ! کیا نہیں ہے

مکان و لامکاں کیوں پھاند ڈالوں
خُدایا ! تو رگِ جاں سے قریں ہے

یہ خاکی دفن ہے پیکر میں اپنے
کرم تیرا کہ سیّارہ نشیں ہے

کسی بھی حال میں چاہے اسے رکھ
تری تخلیق کا ایرجؔ امیں ہے

میٹھی میٹھی نیند سُلانے والا تو
دن جنگل میں رات جگانے والا تو

تیرے آگے ماتھا ٹیکنے والا میں
سجدوں کا احساس دِلانے والا تو

ساحل ساحل ناؤ ڈبونے والا میں
میرا بیڑہ پار لگانے والا تو

شبنم شبنم آنکھ بھگونے والا میں
صحرا صحرا پیاس بجھانے والا تو

تیز ہوائیں، مٹی، شعلے، پانی، میں
اور اِن سے انسان بنانے والا تو

سایہ سایہ نقش بکھرنے والا میں
نکہت نکہت رنگ ملانے والا تو

بستی بستی خاک اُڑانے والا میں
دشت وجبل میں پھول کھلانے والا تو

دامن تہی نہ اٹھنا مری حضوری سے
ایرؔج کو یہ درس پڑھانے والا تو

قرآن کی تفسیر محمدؐ صلِّ علیٰ
اللہ کی تنویر محمدؐ صلِّ علیٰ

دشمن گھات میں تیغ وسناں سے لیس مگر
سامنے بے شمشیر محمدؐ صلِّ علیٰ

کفر کی ظلمت سے کرنے والے آزاد
انسان کی تقدیر محمدؐ صلِّ علیٰ

عرشِ معلّیٰ بھی کب سے تھا چشم براہ
بخشیں گے توقیر محمدؐ صلِّ علیٰ

مجھ پر بھی ہو نظرِ عنایت بہرِ خدا
میں ہوں بہت دلگیر محمدؐ صلِّ علیٰ

گُل خوشبو خواہش، تتلی پر، آئینے
خواب : مگر تعبیر محمدؐ صلِّ علیٰ

میرے لبوں پر اللہ ہُو بس ایک دُعا
اور اس کی تاثیر محمدؐ صلِّ علیٰ

نجم السحر بھی، کاہکشاں بھی، ایرج بھی
آپ کی چاہ میں گیر محمدؐ صلِّ علیٰ

قرارِ دل و جاں امامِ حسینؑ
مرے غم کا درماں امامِ حسینؑ

سرِ کربلا سر کٹا کر بھی
ہوئے حق پہ قرباں امامِ حسینؑ

شہادت بھی میراث اُن کی ہوئی
شہیدِ شہیداں امامِ حسینؑ

نواسے محمدؐ کے ابنِ علیؑ
خدا کے ثنا خواں امامِ حسینؑ

محمدؐ کے حلقہ بگوشوں میں ہوں
کیا مجھ پہ احساں امامِ حسینؑ

وہی جن کی شمشیر دارلاماں
ہمارے نگہباں امامِ حسینؑ

بہتّر گلابوں کا نوحہ لکھوں
کہ ہو جس کا عنواں امامِ حسینؑ

ہو ایرج کو کیوں فکرِ روزِ حساب
ہیں اس پر مہرباں امامِ حسینؑ

ذات حرارت، لمس تمازت، پیکر آگ
یعنی شام شفق سورج پس منظر آگ

چھُو کر دیکھو اس بستی کے لوگوں کو
باہر باہر! خوشبو، اندر اندر! آگ

خواب میں اک اک راہگذر تھی دھُول دھواں
جاگے تو چپ چاپ کھڑی تھی سر پر آگ

ہاتھ اٹھائے پت جھڑ میں معصوم چنار
مردہ دھوپ ہے لیکن منظر منظر آگ

شب کا کرشمہ! سنّاٹا، خوش رنگ سکُوت
دن کا کرتب! ساحل موج سمندر آگ

کس کو فرصت ہے اب کے مارے شبخون
دشمن لیکن رکھتا ہے دہکا کر آگ

جو جی چاہے تن تاپو یا من تاپو
ہم تو لگا آئے ہیں ایرجؔ گھر گھر آگ

پھول تو پھول ہیں مٹی نے مہک پائی ہے
اُس کی گلیوں سے گذر کر یہ ہوا آئی ہے

سانس لے پاؤں مگر لمس سے محروم رہوں
اب کے کچھ اور ہی اندازِ مسیحائی ہے

کچھ اُسے بھی نہ رہا اپنے مراسم کا خیال
کچھ مری سوچ بھی بے چہرہ ہے، ہرجائی ہے

آگہی! خُلد سے کم پر کبھی راضی نہ ہوئی
دل کی بات اور، سرابوں کا تمنّائی ہے

یہ غلط ہے کہ مجھے راہ میں اُس نے چھیڑا
یہ مگر سچ ہے مری اُس سے شناسائی ہے

کچّے برتن کی طرح ٹوٹ گیا ہوں ایرجؔ
کہ پذیرائی میں پنہاں مری پسپائی ہے

ایسا ہو بن سنور کے بہت جگمگائے شب
ایسا ہو اس کے بعد مرے گھر نہ آئے شب

پھر چاند احتیاط کا دینے لگا ہے آنچ
پھر ہم کو آزمانے لگی انتہائے شب

صحرا خیال، جسم سمندر، صدا سکوت
اس انتظار میں ہیں کسی سمت جائے شب

ایسا نہ ہو کہ دستِ دعا وا نہ کر سکیں
ایسا نہ ہو کہ ہم کو لگے بددعائے شب

پیچھے غنیم، سامنے جسموں کی کھائیاں
لے جائے، دیکھیں، کس طرف ہم کو ہوائے شب

دیکھا تو اشکبار لگا قطرہ قطرہ پھول
سوچا تو تار تار پڑی تھی ردائے شب

ایرجِ شعورِ ذات، مکاں، لامکاں، زماں
کچھ دن کا انتشار ہے کچھ تنگنائے شب

ڈھلکتے آنسوؤں کی نم فصیلوں میں قید چہرے تلاش کرنا
سمندروں کے سفر سے لوٹو تو یہ جزیرے تلاش کرنا

سراب چشموں کی سرزمیں بھی دُعا دفینے اُگل سکے گی
یہ خواب دیکھے تھے ہم نے تم نے یہ خواب پھر سے تلاش کرنا

تم اپنی ضد میں سلگتے ساحل کی خاک ناحق ہی چھانتے ہو
تمام موتی چھپے ہوئے ہیں لہو میں میرے تلاش کرنا

یہ چاہتوں کی دبیز دلدل ہے اس میں ہرگز قدم نہ رکھنا
جو پار اُترنے کی آرزو ہو تو دل سفینے تلاش کرنا

میں جب سے ٹوٹا ہوں شاخِ منظر سے میری بس اک یہی ہوس ہے
سفید آندھی کی زد میں آئے ہوئے پرندے تلاش کرنا

یہ میرے لفظوں کی سادگی ہے کہ ہے تخیُّل کی بیکرانی
کتاب چہروں کو چاند لکھنا افق اُجالے تلاش کرنا

امانتوں کی طرح سنبھالیں محبّتوں کے الاؤ ایرج
پرانے قصّے کہانیوں میں وہ آبگینے تلاش کرنا

ہوں سرِ دارِ مکافات مری خیر نہیں
بے اثر وردِ مناجات مری خیر نہیں

مجھ سے عاصی کے گناہوں کی بھی بخشش ہو جائے
شافعِ ارض و سماوات مری خیر نہیں

پھر اُتارا گیا خواہش کے سرابوں میں مجھے
خیر ہو قبلۂ حاجات مری خیر نہیں

ہجر میں جان نہ دی خیر منائی میں نے
آج ہے اذنِ ملاقات مری خیر نہیں

ایک میں ہوں کہ نہیں محرمِ اسمِ اعظم
اک ترا شہرِ طلسمات مری خیر نہیں

اب تو ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے
اب کہاں عدل و مساوات مری خیر نہیں

غیر ممکن بھی ہے مشکل بھی مظفرؔ ایرج
شاہ کی مجھ سے مدارات مری خیر نہیں

آنگن پھول، نشیلے موسم، چاند صنوبر، لوٹ گئے
جو پسِ منظر تک آئے تھے سارے منظر لوٹ گئے

ہاں پتّھر میں ڈھلتے ڈھلتے بس اتنا ہی یاد رہا
مجھ پر منتر پھونکتے پھونکتے ہی جادوگر لوٹ گئے

آخری لمحے کی سُولی پر چڑھ کر جانے کیا سوچا تھا
ہم تو آپ کے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گئے

تپتی، بنجر یادوں کی پہنائیاں کس کو راس آئیں
دشت کے دامن تک آ کر چپ چاپ سمندر لوٹ گئے

سب اپنا کشکول لیے چلّاتے رہے قریہ قریہ
اس دنیا سے خالی ہاتھ ہی کتنے سکندر لوٹ گئے

ساحل سے ٹکراتی موجیں کہتی تھیں آ دُور نکل
شام کے تیور دیکھ کے لیکن ہم سے شناور لوٹ گئے

ساری اڑانیں سوئے فلک آسان ہوئیں لیکن ایرجؔ
وہ کس سمت کے پنچھی تھے جو بے بال و پر لوٹ گئے

(غالبؔ کی نذر)

دھنک وجود، شعور آسماں غزل تیری
ستارے، چاند، افق، کہکشاں غزل تیری

وہ اک سوال! نہ دے پایا جس کا کوئی جواب
وہ اک خیال! کہ جس میں عیاں غزل تیری

ہزار اس کے معانی، ہزار توجیہیں
مرے لیے عجب اک امتحاں غزل تیری

حقیقتوں کے بیاباں میں بارشوں کی طرح
ہے ایک خواب کی صورت نہاں غزل تیری

پڑھیں تو پھول کھلیں، گنگنائیں دیپ جلیں
نہ کوئی وہم نہ کوئی گماں غزل تیری

نہ کوئی تھاہ، نہ ساحل، نہ سرحدیں ایرجؔ
کہ موج موج رواں بیکراں غزل تیری

خلا، بستی زمیں کیا! آسماں تک
یقیں کی سرحدیں پھیلیں گماں تک

میں اپنی ذات کے امکاں میں ہوں
شنیدہ، ناشنیدہ لامکاں تک

نہ ممکن لفظ کی تفسیر کوئی
نہ کوئی حرف پہنچا داستاں تک

نفاست رنگ، تتلی پھول، خواہش
سفر اندر سفر دیوارِ جاں تک

غضب! میں بھی سرابوں کا مسافر
عجب! میں آگیا خود ہی یہاں تک

تجسُّس! زندگانی کی علامت
تعقُّل! حادثے کے امتحاں تک

میں سمتوں میں سمٹ جاؤں گا ایرؔج
مری تجدید ہو ممکن کہاں تک

آنکھ کی پہنائی کے آگے سات سمندر لکھ دینا
بے سمتی سے لامسکن تک میرا مقدّر لکھ دینا

ہم بے جوڑ ستاروں سے جب بھی ٹوٹے بے نور ہوئے
اب کے ہمارے نام زمیں کی خاک حنا بھر لکھ دینا

صدیاں بیتیں، اب بھی نیا ہے، ہر خط میں مضمون، ترا
چاند سا چہرہ، جھیل سی آنکھیں، تاج سا پیکر لکھ دینا

ساون آنکھوں کے درپن سے پتھر خواب کہاں تک دیکھوں
میرے حصّے میں بھی کوئی خوش کن منظر لکھ دینا

اس سے قبل کہ میں صحرا کی تنہائی میں کھو جاؤں
میری رہائی کا پروانہ دھوپ سفر پر لکھ دینا

اُفق لہو کے پس منظر میں پوشیدہ تتلی تصویریں
خواب شفق آنکھوں کے ایرج چھین سکیں گر لکھ دینا

اُفق اُفق تا دیدِ فسردہ منظر منظر کس کا ہے
دشت اگر میرا حصّہ ہے تو یہ سمندر کس کا ہے

تم ہو اہلِ نظر میں شامل تم ہی بتا سکتے ہو بتاؤ
دل کشکول سجایا کس نے سامنے خنجر کس کا ہے

سوچ رہی ہے دیدۂ عبرت دیکھ کے پیکر ہم جیسا
آئینوں میں آہن آہن دستِ ہنرور کس کا ہے

دل دہلیز پہ لو آنکھوں کی تھر تھر پل پل کانپے ہے
جانے کس کی راہ تکے ہے جانے اِسے ڈر کس کا ہے

چاند، ہتھیلی، نقش پرائے، خوشبو خوشبو مہکائیں
جاگتی آنکھوں کا پس منظر خواب بدن بھر کس کا ہے

آپ کو کیا بتلا سکتا ہے ایرج کو خود علم نہیں
ذکرِ پریشاں آج فقیروں کے ڈیرے پر کس کا ہے

ہوا وجود سبھی میں ، ٹھہر بھی سکتا ہوں
گلاب رت کی مہک سے نکھر بھی سکتا ہوں

نہ چھُو کے دیکھنا مجھ کو میں کاغذی کپڑا
تمہارے ہاتھ لگانے سے مر بھی سکتا ہوں

بچائے رکھنا مجھے وقت کی ہواؤں سے
کہ مشتِ خاک ہوں دیکھو بکھر بھی سکتا ہوں

بگڑ گیا ہوں ، یہ مانا ، مگر یقیں ہے مجھے
تُو ہاتھ اُٹھا کے دعا دے سنور بھی سکتا ہوں

کرشمہ ! پھول سراپا ، طلسم ! خار صفت
تمہارے دل میں کسی دن اُتر بھی سکتا ہوں

مجھے نہ یاد دلانا کھنڈر کھنڈر ماضی
گذشتہ کل کے تصوّر سے ڈر بھی سکتا ہوں

میں سوچتا بھی نہ تھا اس طرح کبھی ایرجؔ
بدن سراب سفر سے گذر بھی سکتا ہوں

قطرہ قطرہ شبنم آنکھ بھگوتی تھی
بند کلی تنہا ٹہنی پر سوئی تھی

ہاتھ میں کھڑکی اور چہرے پر دروازہ
یہ مخلوق تو پہلے میرے جیسی تھی

کیسا تیاگ! کہاں کا تیرتھ! کیا سنیاس
شِیو مالا تو ہر جوگن کو جپنی تھی

رات کھنڈر، روحیں بینائی، عالم ہُو
میرے جسم کی بوٹی بوٹی مچلی تھی

فصلِ رسائی، شاخِ شجر، خوشبو خوشبو
دیکھا تو قسمت میں جدائی لکھی تھی

دل ہیرے پر داؤ لگایا ہار گیا
اور یہ بازی اپنی آخری بازی تھی

کب ہم نے اے رنجِ خواہش کشکول بھرا
کب دنیا کی کوئی بھی شئے اپنی تھی

نہ ابتدا نہ کوئی اس کی انتہا ہوگی
کہانی میری ہر انداز سے جُدا ہوگی

ترستے لب، لبِ ساحل پہ منتظر ہوں گے
سُلگتی آنکھ تصوّر سے ماورا ہوگی

الٰہی وصل کا ان کو بھی کچھ سلیقہ دے
ہمارے ہونٹوں پہ اب کے یہی دُعا ہوگی

وہ مجھ سے چھین گیا ہے مرے خیال کے پھول
بھلا اب اور اچنبھے کی بات کیا ہوگی

نہ جھانکنا نہ کسی اور کو جگا دینا
تمھارے در پہ اگر رات کو صدا ہوگی

بھٹکتے لوگ ہیں یا سایہ سایہ دیواریں
یہ دھوپ ساتھ چلے کچھ تو آنکھ وا ہوگی

بٹھائے پانی پہ ایرجؔ کسی نے پھر پہرے
سُنا ہے شام اترتے ہی کربلا ہوگی

سورج بستی، گود زمیں کی، ماہ و قمر معلوم نہیں
ہم کو بھائی منظّر ایرج تیرا گھر معلوم نہیں

تنہائی کے تپتے صحرا میں تنہائی کا سایہ
زادِ سفر صدیوں کے لیے اور اگلا سفر معلوم نہیں

مغرب سے سورج اُگنے کی یارو منادی ہو جائے
ورنہ بھٹکتا ہوگا کب تک خاک بہ سر معلوم نہیں

ایک ہی نقطے پر ساکن ہیں شب، سنّاٹا، تاریکی
کب بکھریں گے شبنم موتی کب ہو سحر معلوم نہیں

یاد کے پتّھر ڈھوتے ڈھوتے دل دنیا پتّھریلی ہوئی
کوہکن و مجنوں سے ملیں گے کس پت پر معلوم نہیں

کانٹوں کی یاری میں ملی ایرج کو رسائی پھولوں تک
لیکن خوشبو چھو لینے کا اس کو ہنر معلوم نہیں

دُعا ثمر، نہیں، شاخِ دعا تو ہو جاؤں
سفر سے پہلے سفر آشنا تو ہو جاؤں

میں تم کو پار اُتاروں جو غرق کر نہ سکا
خدا نہیں، نہ سہی، ناخدا تو ہو جاؤں

کسی نے ہاتھ میں سورج چھپا کے لکھ بھیجا
میں خاک، آگ، سمندر، ہوا تو ہو جاؤں

حصارِ ذات سیاہ فام سامری کا طلسم
اُڑا دوں زاغ کی گردن رہا تو ہو جاؤں

اسی بہانے غمِ زندگی ہی راس آئے
نمازِ عشق کسی دن قضا تو ہو جاؤں

یہی سمجھ کے زمانے سے کر رہا ہوں وفا
کسی کا قرض ہوں اب کے ادا تو ہو جاؤں

قیامتیں ہیں بپا میری ذات میں ایرج
تمھاری بات سُنوں بے صدا تو ہو جاؤں

آج سے چھوٹا تو کل میں محبوس ہوا
یاروں میں یوں پل پل میں محبوس ہوا

ارض و سما کی وسعت ایسے تنگ ہوئی
اپنی ذات کے مقتل میں محبوس ہوا

شام کے نام اُفق نے اپنا خون کیا
سورج رات کے آنچل میں محبوس ہوا

کانچ کے بازیگر نے میرا نام لکھا
اور اگلے پل بادل میں محبوس ہوا

مرجاتے ہی میرے دیدوں کا پانی
دل دامن کی دلدل میں محبوس ہوا

شام شفق نے پھیلائی اک سیہ لکیر
آنکھ کا دریا کاجل میں محبوس ہوا

بیج زیاں کا ایک تناور پیڑ مگر
کاٹنے بیٹھا تو پھل میں محبوس ہوا

تینوں لوکوں کا گیانی ایرج شری رام
کچھ پتھر کچھ پیتل میں محبوس ہوا

دل گیا اس بات پر ماتم کریں
ہم کہاں ایسے زیاں کا غم کریں

لمس کا سورج ابھی تک خُوں میں ہے
سوچتے ہیں اس کی شدّت کم کریں

آنچ لمحوں میں سمجھ آتا نہیں
لَو بڑھائیں روشنی مدھم کریں

پھیلتا ہے پھیلنے دیجے اِسے
زخم قربت کا ہے کیا مرہم کریں

حال کی سیڑھی پہ ماضی کا فریب
کیسے مستقبل میں مستحکم کریں

ہم سے ہی ہے رقصِ آئینہ کی ساکھ
مسکرائیں، آنکھ چاہے نم کریں

جب اُڑانی ہی ہیں دامن دھجیّاں
کیوں نہ بسم اللہ ایرجؔ ہم کریں

اس موسم کی پہلی بارش: گھر ٹوٹا
اشک: کہ آنکھوں سے ٹپکا اندر ٹوٹا

دیوانوں کو پتّھر مارنے والا میں
پہلا پتّھر پھینکا میرا سر ٹوٹا

دھوپ طلسم میں بس اتنی ہی شدّت تھی
میرے سامنے آیا دُھندلا کر ٹوٹا

اب کے برس جسموں کی نمی برسات ہوئی
چھت ٹپکی، کمرے بھیگے، بستر ٹوٹا

آنکھ سفینے لمحوں میں غرقاب ہوئے
دل کا باندھ کہ نازک تھا اکثر ٹوٹا

رات ہواؤں کے تیور کچھ اور ہی تھے
شاخ کوئی ٹوٹی تو ساتھ شجر ٹوٹا

دھوپ نے پھیلایا ہے ہر سو اپنا جال
جب سے برف شگوفوں کا منظر ٹوٹا

لب کشکول دعاؤں سے لبریز رہا
لیکن ایرجؔ! کب تیرا ساغر ٹوٹا

ایک قطرے میں قید رہتا تھا
وہ سمندر ہے کس نے سوچا تھا

دشت اطراف پھیلنے دیجے
اتنا کہہ کر وہ خوب رویا تھا

اپنے افکار کے پسِ پردہ
میں انا اپنی بیچ آیا تھا

لفظ دہلیز پار کرنی تھی
وہ معانی کے جال بنتا تھا

میں ہوس کار ناشنیدہ حرف
ہر عبارت میں بے سلیقہ تھا

اب تو دریا گذر گیا سر سے
غم مگر ڈوبتے کا تنکا تھا

تم سے تنہائیاں بھلی ایرجؔ
اُس نے جانے کے بعد لکھا تھا

شعلہ شعلہ صنوبروں میں اُتار
پھر مجھے سوکھے جنگلوں میں اُتار

یا سمندر اُتار دے مجھ میں
یا مجھی کو سمندروں میں اُتار

آئینہ آئینہ ہے دستِ سوال
کوئی چہرہ تو آئینوں میں اُتار

سرفروشوں نہ جاں نثاروں میں
میرے رب! مجھ کو بزدلوں میں اُتار

جو کرم کے ہُنر سے ہوں واقف
اب کے ایسے ستمگروں میں اُتار

سوچ پتّھر، حواس آئینے
کچھ نئے واہمے دلوں میں اُتار

حرف پیکر تراش کر ایرج
لفظ خنجر عبارتوں میں اُتار

سیماب اثر، چاند بدن، پھول صدا ہوں
پارکھ ہو تو پرکھو مجھے میں کس کی ادا ہوں

کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرا نامۂ اعمال
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں

تُو مجھ کو جھٹک، میری انا توڑ، مگر میں
سرتا بہ قدم تیرے لیے دستِ دعا ہوں

اب اور نہ کھولو میری تنہائی کے پیچ اک
میں دستِ ہنرور کی طرح ٹوٹ چکا ہوں

ممکن ہے لہر کوئی بہا مجھ کو بھی لے جائے
میں صدیوں سے اُمید کے ساحل پہ کھڑا ہوں

کیوں دشت، سیہ دشت، لکھا میرا مقدّر
معبود! میں عاصی سہی بندہ تو ترا ہوں

آیرج! ہوں بھلا کس کے لیے زندہ ازل سے
کیا جانئے کس کس کی دعاؤں کا صِلا ہوں

پانی نقش ابھارے کون
چھُولے دھُوپ کنارے کون

عشق بساط پہ دل بازی
میں جیتوں تو ہارے کون

محشر میں پیاسوں کے سوا
مولا نام پکارے کون

تنکا تنکا دن کاٹا
شب کانٹوں پہ گذارے کون

گھر مرگھٹ روشن کرتا
چاند فلک سے اُتارے کون

بے رُت موسم بے پھل پیڑ
میرا رُوپ سنوارے کون

اگلے برس یہ موسم پھول
کیا معلوم نکھارے کون

ایرِج دوست ہو یا دشمن
رب راکھے جس مارے کون

اگلی مراد حرفِ دعا تک نہ آئے گی
یا لامکاں سے میری صدا تک نہ آئے گی

میرا وجود خاک میں ملنے کی دیر ہے
کہتے ہیں اس زمیں پہ ہوا تک نہ آئے گی

ایسا فسوں زدہ جو رہا ضابطۂ قُرب
جسموں سے اب کے بُوئے قبا تک نہ آئے گی

مقتول آپ اور میں قاتل بھی آپ ہوں
یہ مثلِ ذات جرم و سزا تک نہ آئے گی

جتنی اٹھا سکو گے اٹھاؤ فصیلِ شام
ورنہ حیاتِ شب کی ردا تک نہ آئے گی

ایرجؔ سمیٹ خود کو نہ اپنے ہی خول میں
یہ احتیاط چشمِ رسا تک نہ آئے گی

پہلے یہ بادبان جلانے کی بات کر
پھر ساحلوں پہ مجھ کو بسانے کی بات کر

یوں سوچ سوچ کر ہی نہ اپنے پہ بوجھ بن
آنے کی بات ہو تو نہ آنے کی بات کر

کس درجہ بے بساط ہیں ماضی کی دھڑکنیں
زندوں میں ہے تو اگلے زمانے کی بات کر

یا اپنے آپ سے ہی کوئی گھات کر لے تُو
یا مجھ کو انگلیوں پہ نچانے کی بات کر

جینا ہے چند روز تو اچھا ہے ہنس کے جی
رونے کی بات کر نہ رُلانے کی بات کر

ممکن یہی ہے ہم کو ملے اذنِ سفر آج
رہوارِ زیست اگلے ٹھکانے کی بات کر

ایرج کہیں نہ آئینہ تجھ سے کرے سوال
تُو عکس عکس زخم چھپانے کی بات کر

ساون آنکھوں سے جب جھلکے دل آنگن میں یاد گلاب
کِھل کِھل اٹھے رُوپ سمندر چاند بدن میں یاد گلاب

لب صحرا کشکول سجائے، دریا دریا موج عذاب
کانٹے ہی کانٹے بو دیتا ہے تن من میں یاد گلاب

شب دہلیز پہ موسم بیتے دن جنگل میں اترے شام
کیا کیا رنگ اُفق منظر کے سوچے بن میں یاد گلاب

خونِ حرارت ساکن ہووے، برف شگوفے جسم کی آنچ
جب جب ناگن پھن لہرائے مدھ یوون میں یاد گلاب

ٹیک لگا کر ہاتھ سرہانے سے جب ماضی پڑھتا ہوں
نور ستاروں سے چھینے ہے نیل گگن میں یاد گلاب

کیا تتلی تصویریں کھینچوں سُن آنکھوں کے منظر سے
ایسا کون ہے چاند مقدّر لائے گہن میں یاد گلاب

عشق منڈھیر پہ ایرجؔ صاحب عمر گذاری دشت سراب
پھر کیونکر ہے عکس کشیدہ رُخ درپن میں یاد گلاب

یہ راہ بھی جاتی ہے مرے دل کے کھنڈر تک
تھک ہار کے میں بیٹھ گیا اگلے سفر تک

پتّہ کوئی کھڑکا نہ ہی پاؤں کی ہوئی چاپ
وہ تیر کے آئی مری دہلیزِ نظر تک

قرنوں میں بھی شاید نہ اِسے کھول سکیں گے
جو بند گلی ہے میرے دل سے تیرے در تک

اب دیتا ہے ہر شخص مجھے پھول دعائیں
کانٹوں سے نباہ کروں دعاؤں میں اثر تک

آنکھوں کے شفق زاروں میں کاجل کے دھند لگے
پھر شام اتر آئی اُفق سے میرے گھر تک

جگنو کی چمک شب کی سیاہی نے ہڑپ لی
روتی رہی شبنم بھی مرے ساتھ سحر تک

ایرج کو ہے غم دیکھ کے حالات کے تیور
نیلام نہ ہو جائے کہیں اُس کا ہنر تک

ہر دروازے پر دستک دی جانے کس کو دیکھا تھا
چہروں کی پہچان کِسے تھی ہاتھوں میں آئینا تھا

چوراہے پر اک ہمزاد کو لوگوں نے سنگسار کیا
مجھ کو اچانک یاد آیا میں بھی اس شہر میں رہتا تھا

ہلکے ہلکے نقش قدم تھے اور سفر صحرا صحرا
ایک مسافر پاؤں شکستہ اس رستے میں تنہا تھا

سوچ قندیلوں میں روشن تھا تاج محل میرے زخموں کا
ورنہ اماوس کی راتیں تھیں چاند بہت پژمُردا تھا

شبنم آنسو، دُھوپ ردائیں، پھول بدن بکھرا بکھرا
بس اتنا ہی یاد آتا ہے وہ خوشبو کا جھونکا تھا

تاج کسی شہزادے کا ہو یا ہو بھکاری کا کاسہ
ایرج صاحب دل کا عنواں آپ سے کس نے پوچھا تھا

گو لاکھ کہیں گردشِ حالات میں گُم ہیں
سچ ہم سے سنو لوگ خرافات میں گُم ہیں

جذبوں میں حرارت نہ شفق ذات میں سُرخی
پتھر کی طرح ارضِ طلسمات میں گُم ہیں

سورج ہی ہے ہاتھوں میں نہ ہی چاند جبیں پر
کیا بات ہے کچھ کہیے کہ کس بات میں گُم ہیں

اب ہوتی نہیں ہم سے کناروں کی تمنّا
گرداب کی صورتِ سَفرِ ذات میں گُم ہیں

لے جائیں کہاں کس کو حوادث کے تھپیڑے
محفوظ ہیں ہم ایسے سوالات میں گُم ہیں

جب ہوگی ملاقات نہ ہو جائے قیامت
اچھا ہے کہ ہم ایسے خیالات میں گُم ہیں

تقدیسِ ہُنر، شاخِ شعر، کاسُرایرج
صدیوں سے سوالات وجوابات میں گُم ہیں

آج اس بستی میں بھی ہر شخص ہے پتّھر لیے
دشمنوں سے کیا شکایت دوست ہیں خنجر لیے

جس نے قرنوں کی مسافت سے ہمیں محرم کیا
وہ اُجالوں کا پیمبر آگیا خاور لیے

غم نہیں فرزانے شمعیں گُل کریں سورج بجھائیں
اب تو دیوانے نکلتے ہیں مہ و اختر لیے

دل سمندر قطرہ قطرہ پیجیے پھر ہو نہ ہو
سر پھری پاگل ہوا کا معجزہ منظر لیے

کِھل اٹھے گا اب کے مقتل میں کوئی منظر نیا
قتل کرنے آرہے ہیں ہاتھ میں ساغر لیے

کون دے آیا ہے صحرا میں اذانیں چار سُو
کون اُترا ہے پہاڑوں سے ابھی اژدر لیے

آج بھی سنگسار ایرجؔ ہو نہیں پاؤں گا میں
آج پتّھر مارنے والے ہی ہیں گوہر لیے

تیرے میرے درد کا رشتہ آسودہ
شہر کا شہر مگر اب تک نا آسودہ

رستے، پاؤں، چھالے، منزل، موڑ، سراب
یاد سفر کا سایہ سایہ آسودہ

رنج کی عظمت میرے اور تمہارے بیچ
دو دھاری تلوار کا کاٹا آسودہ

تم نے اس میں آ کر کیوں منتر پھونکے
دل کا مکاں آسیب زدہ تھا آسودہ

یاد کے کنکر چُنتے چُنتے عمر کٹی
اور نظر آتا ہوں کتنا آسودہ

اب کیا مجھ سے چھین ہی سکتا ہے ایرج
اب کیا میرے پاس بچے گا آسودہ

دھاگا میرے ہاتھ پہ باندھا راکھی جس کا نام رکھا
یعنی فصل کے پک جاتے ہی اُس نے پہرہ سخت کیا

جانے دل پر کیا گذری ہو جب شب کے سنّاٹے میں
میں نے ماضی ہاتھ سے جھٹکا اور مستقبل بھول گیا

یوں تو انگوروں کی سب بیلیں میری کھڑکی تک آئیں
لیکن ہاتھ بڑھا کر بھی کب میں اُن کو چھُو پایا تھا

ہم سنیاسی! گیان کے بھُوکے جنگل جنگل پھرتے ہیں
دُھونی رما لیتے ہیں برسوں دیکھ کے پیپل کی چھایا

بچپن کے دوراہے تک ہم گلیوں گلیوں ساتھ پھرے
پاؤں جوانی میں رکھتے ہی جانے کیوں رستہ بدلا

ہم اُس راہ گذر کے راہی جس میں سنگِ میل نہ پیڑ
وسعت وسعت دھوپ اشارہ وحشت وحشت گھر ایسا

ایرجؔ صاحب قرنوں قرنوں آپ ہی آپ نظر آئے
کیسے یہ بکھراؤ سمیٹوں کیسے دیکھوں آئینا

ایک میں اک تیری یادوں کی نوازش کتنی
ایسے خطرات میں ڈھے جانے کی خواہش کتنی

جسم صحرا یہ دعا پھول کوئی اُگ نہ سکا
دل سمندر میں رہی موجوں کی لرزش کتنی

چھن گیا آنکھ جھپکنے میں مرا سارا وجود
غیر ممکن ہوئی سائوں کی پرستش کتنی

اب تو صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہوتا ہے
زندگی تیرے ہی پاؤں میں ہے لغزش کتنی

وہ پسِ پردہ مرے قتل کے درپے ہے ابھی
اور کُھلے عام مرے حق میں سفارش کتنی

گھر کی دیواروں کو تصویر بنا لیتے ہیں
لوگ کرتے ہیں تخیّل کی ستائش کتنی

کیسے ملبوس میں خود کو میں چھپاؤں ایرج
ہر طرف ہے میرے زخموں کی نمائش کتنی

جب بھی تیرا نام لیا ہے
ہم نے دل پر ہاتھ رکھا ہے

تنہائی کا چبھتا موسم
فصلِ رسائی سے مانگا ہے

برسوں پرانی خوشبو مہکی
شاید تم نے یاد کیا ہے

وصل کی خواہش قطرہ قطرہ
عشق سمندر، دل دریا ہے

کس کو دکھاؤں، کیسے چھپاؤں
اُس نے پہلا خط بھیجا ہے

خار، تمازت، کنکر، چھالے
اس رہ میں ہر موڑ نیا ہے

تُو اپنی ہی کھوج میں ایرجؔ
گُم ہو جائے میری دُعا ہے

زخموں میں تری چاہت وہ آگ لگا آئی
دنیا بھی تماشائی میں خود بھی تماشائی

تم کتنا ہی سر پھوڑو، ممکن نہیں ہمسفرو
آئینوں کی بستی میں چہروں سے شناسائی

وہ پھول سویروں کے خط لکھتا رہا مجھ کو
میں رات مقدّر ہوں یہ بات بھی سمجھائی

انکار کی صورت میں تسلیم و رضا کیونکر
کیا پوچھتے ہو اُس سے سودائی ہے سودائی

کچھ زخم دریدہ بھی، کچھ آنچ پژیدہ بھی
کچھ عکس کشیدہ بھی مجھ سے میری تنہائی

دامن سے گریباں تک کچھ اور نہیں پنہاں
یا جذبوں کی شدّت ہے یا درد کی انگڑائی

کیوں اشک سفینوں پر لرزاں ہی رہا ایرج
وہ شخص سمندر کی پی لیتا ہے گہرائی

الٰہی کیسا موسم آگیا ہے
ہر اک پل مجھ کو میرا سامنا ہے

بس اک سنگ اور کیچڑ چار جانب
ہمارا ظرف ہم کو روکتا ہے

پلٹ کر آئے گا خود شب پرندہ
اُجالوں کے تناظر میں چھپا ہے

عجب بے چہرگی منظر میں کھو کر
وہ ٹوٹے آئینوں کو تک رہا ہے

ہوا دستک تو دل کھڑکی یہ ہوگی
اگرچہ گھر کا دروازہ کھُلا ہے

اُسے پچھلے پہر کا خوف کیوں ہو
ملے تو حق! ادا ہو تو دُعا ہے

فضائیں، زرد پتّے اور ایرج
ازل سے سلسلہ در سلسلا ہے

سفر کی کلفتیں میرے لیے ہیں
یہ کیسی منزلیں میرے لیے ہیں

نہ لب امکاں، نہ آنکھیں استعارہ
نہ منظر خواہشیں میرے لیے ہیں

سحر دشمن، فسردہ، شب مقدّر
سیہ رُوصورتیں میرے لیے ہیں

بدن اسرا خوشبو، لمس خواہش،
عجب دھندلاہٹیں میرے لیے ہیں

زمیں سے تا فلک پرواز میں ہوں
کہ مبہم سرحدیں میرے لیے ہیں

مرا کربِ محبّت نارسائی
تری سب نفرتیں میرے لیے ہیں

جبینیں، آستاں تیرے ہوں ایرجؔ
صحیفے، آئتیں میرے لیے ہیں

اک تمہاری اک میری ریشمی قبائیں دو
لے اڑیں مہک صورت تیز تھیں ہوائیں دو

ایک شام ڈھلنے کی، ایک صبح ہونے کی
شب کھنڈر سے آتی ہیں آج بھی صدائیں دو

اس سے بڑھ کے بھی کوئی سانحہ بھلا کیا ہو
روئے ہر کوئی تنہا اور مسکرائیں دو

پہلے تم سے ملنے کی، مل کے پھر بچھڑنے کی
ساری عمر پچھتایا کیا ہوئیں خطائیں دو

رب امان میں رکھے غم سے آشنا نہ کرے
دل سے دے رہا ہوں تمھیں ہر گھڑی دعائیں دو

رُخ گلاب بھی مہکیں لب شراب بھی چھلکے
ٹوٹ کر اگر برسیں سرپھری گھٹائیں دو

شیلف میں سلیقے سے کون رکھ گیا ایرج
یہ شکستہ بوسیدہ ان چھوئی ردائیں دو

کچھ اُس کو خیالِ دلِ بیمار نہیں ہے
وہ شخص کہ جینے سے بھی بے زار نہیں ہے

دینا ہے کبھی دھوپ کی اک بُوند ہی دیدے
یہ دل تو سمندر کا طلبگار نہیں ہے

میں حرفِ تکلّم سے ہوں محروم ازل سے
کیا تم میں بھی کچھ جرأتِ اظہار نہیں ہے

اب میرا مقدّر ہے کڑی دھوپ کا صحرا
اب میرے لیے سایۂ دیوار نہیں ہے

سچ بول کے کیوں پی لے کوئی زہر کا پیالہ
اس شہر میں سچ زینتِ دربار نہیں ہے

ہر محفلِ احباب سے معتوب ہے ایرجؔ
شاید وہ اداؤں کا خریدار نہیں ہے

ہیروں کا فسوں حسن کے ترا جسم ڈھلا تھا
شعلہ تھا مگر کانچ کے برتن میں رکھا تھا

منصف تھا تو انصاف کی کیوں دیتا دُہائی
قاتل تھا تو کیوں ہنس کے سرِ دار گیا تھا

بکنے کے لیے یوسفِ کنعاں بھی تھے لیکن
میں تیری اداؤں کا خریدار ہوا تھا

خوشبو کی طرح لمس تمہارا نہ بکھر جائے
اس شدّتِ احساس نے چھونے نہ دیا تھا

گلنار شفق، آگ بدن، چاند بداماں
رنگوں میں اُبھرنے کو تجھے کس نے کہا تھا

یہ کس کا تصوّر تھا بہت رات گئے آج
ایرج سرِ بازار کئی بار مرا تھا

مل کے ہر بار بچھڑنے کی سزائیں دینا
میں تمھیں بھول نہ پاؤں یہ دعائیں دینا

تم اسی موڑ پہ بیٹھا ہوا پاؤ گے مجھے
دل اگر چاہے تو مڑ مڑ کے صدائیں دینا

میں سلگتی ہوئی صدیوں میں پہنچ جاؤں گا
ہو سکے تم سے مجھے دھوپ ردائیں دینا

نکہتیں جسم کی، جذبات کی کافور مہک
شعلہ ہیں ان کو نہ آنچل کی ہوائیں دینا

اہلِ مطلب ہو کہ کم ظرف تجھے کیا لینا
تو وفادار، ترا کام وفائیں دینا

رات کے پچھلے پہر یاد کا آنسو ایرجؔ
پینے والوں کی طرح پی کے ندائیں دینا

کیا عجب اب کے تھکن بھول ہی جائیں اپنی
لاش کاندھوں پہ اگر ہم بھی اُٹھائیں اپنی

بس یہی سوچ کے چُپ رہتے ہیں چل دیتے ہیں
کون سُن پائے گا صحرا میں صدائیں اپنی

سات نیزے پہ جھلستا ہوا سورج ہوگا
ہم نے جس دن کے لیے رکھ لیں دُعائیں اپنی

جانے کیوں شام کے بڑھتے ہوئے لمبے سائے
چھوڑ آئے ہیں کہیں اور ردائیں اپنی

وہ کہ تجدیدِ مراسم پہ بھی آمادہ نہیں
کون کہتا ہے انھیں یاد دلائیں اپنی

وہ اگر دشت نوردی ہی میں خوش ہیں ایرجؔ
کیوں نہ ہم لوگ بھی پرواز بڑھائیں اپنی

پہلے ادراک کو عرفان شناسا کرتے
پھر بصد شوق مری بات کا چرچا کرتے

ہم تہی فکر نہیں ہیں تو تہی دل بھی نہیں
ہاں تہی دست و گریباں ہیں وفا کیا کرتے

سامنے دھوپ نہ تھی پچھلی طرف سایہ نہ تھا
سر پہ ٹھہرے ہوئے سورج کی نہ پوجا کرتے

عقل فرسودہ روایات میں مدفوں ہے ابھی
آپ کہتے تو ہم اس طرح بھی سوچا کرتے

ہم طلسمات گہہِ عشق میں تنہا ایرج
کس طرح تیرے نہ ہونے کا تماشا کرتے

کہیں زمیں تو کہیں آسماں میں چمکے گا
مرے لہو کا مزہ زندگی میں ابھرے گا

میں اپنا جسم سمیٹے ہوئے ہوں صدیوں سے
بکھر گیا تو نیا انقلاب اُٹھے گا

ترے ہزار جتن بھی نہ اُس کو بدلیں گے
تُو راستے میں ہی ہو گا۔ جواب آئے گا

فراق، سوچ، تڑپ، دشت، شام، تنہائی
مرے نصیب میں کتنے عذاب لکھے گا

بہت قریب نہ جا، بچ کے سامنے سے گذر
وہ اپنے جسم سے بجلی کے جھٹکے دے دے گا

بچھڑ گیا ہے صدا کی طرح سدا کے لیے
اب انتظار کی زحمت وہ کس کو بخشے گا

میں زخم زخم ہوں ایرج مرا لباس بھی چھین
وہ روپ روپ اجالوں میں کیسے بولے گا

نہ بدن کتاب میں پھول ہیں نہ لہو شراب میں ذائقہ
کبھی آکے دیکھ لے غور سے تیرے عشق میں میرا کیا ہوا

یونہی لب خلاؤں میں گاڑ کے کبھی اس کشش سے رہا نہ کر
تیرا لمس پھول بنا گیا میں زمیں کے سینے پہ بوجھ تھا

یہی رات تھی، یہی نور تھا، یہی کہکشاں، یہی نکہتیں
وہ فریب چاند کا دے کے مجھ کو یہ کس کھنڈر میں اُتر گیا

نہ ہی دل جزیروں کی زد میں ہوں نہ سمندروں کی پناہ میں
میرا ریت ریت وجود ہے مجھے سیپیوں میں نہ ڈھونڈنا

کفِ جاں سے سرِ دار تک میں نشیبِ ذات میں قید ہوں
یہی سلسلہ میرا سلسلہ یہی ابتدا یہی انتہا

یونہی منتشر، یونہی مضطرب ہیں نظر سفینوں کے بادباں
یہ ہیں گہرے پانی کی مچھلیاں انھیں ڈر ہوا نہ سراب کا

یہاں میر و غالب و درد ہیں یہاں ایرج آئیں تو کس لیے
یہ تو آفتابوں کا شہر ہے یہاں جگنوؤں کی بساط کیا

لے جائے بھُول آرزو خاک بہ سر کہاں کہاں
بھٹکے تیری تلاش میں ہم بھی مگر کہاں کہاں

شب سرحدوں سے دور ہیں خوابیدہ منزلیں ابھی
شام سی آہٹیں ہوئیں زادِ سفر کہاں کہاں

اچھا ہے تم ہمیں ملے کعبہ جبیں کے آس پاس
ورنہ جھکانے بیٹھتے کاسۂ سر کہاں کہاں

لب ساحلوں پہ کھُل گئے رُخ آئینوں کے کتنے راز
دل کشتیوں کے درمیاں آئے بھنور کہاں کہاں

'کُن' کی ردائیں اوڑھ کر کعبہ میں سومنات میں
پھرتے رہے ہیں ساری عمر در بدر کہاں کہاں

دل بستیوں میں تتلیاں آیرجؔ اڑا کے چل دیا
دیکھیں گے اُن کی یاد کے ٹوٹیں گے پر کہاں کہاں

قدم قدم پہ وہ جب چاہیں امتحاں رکھیں
پڑا جو وقت تو ہم سر پہ آسماں رکھیں

ہم اپنے پھول وجودوں میں خاک بھر دیں مگر
قلم چھپائیں کہاں، انگلیاں کہاں رکھیں

ہمیں تو لُوٹ لیا خواہشوں کی خوشبو نے
یہ سوچتے ہی رہے رات درمیاں رکھیں

ہمارا ظرف کدورت نہیں مگر یہ لوگ
بضد بہت ہیں کہ شعلوں پہ بھی زباں رکھیں

ہر ایک راہ ادھوری ہر اک سفر دشوار
یہ کیسے لوگ ہیں دلدل میں بستیاں رکھیں

وہ بے سمجھ نہیں کوئی اُن سے کہہ تو دے ایرجؔ
سجائے پلکوں پہ خوابوں کی تتلیاں رکھیں

کچھ نہ کچھ میرے لیے چھوڑے گا وہ
کانچ کے مومی بدن میں لمس کی نم کرچیاں بھر دے گا وہ
نیلے پیلے سورجوں کی روشنی میں چاند کا عریاں بدن چاٹے گا وہ
مجھ سے میرا نام کب پوچھے گا وہ
اس کی آنکھوں میں مجھے کیا کیا ملا
میرے جذبوں کو کسی موسم میں تو سمجھے گا وہ
اُس کی پوجا
آخری سانسوں سے وابستہ نہ کرلیں ہم تو کیا سوچے گا وہ
ہاتھ پھیلا کر خدا ہی جانتا ہے
ہم تہی دستوں سے کیا کیا اب کے ہتھیالے گا وہ
ٹوٹتے لمحوں کے منظر نم ہتھیلی پر حنا سے لکھ دیے جس شخص نے
اُس کو سارے شہر کے چہروں میں پہچانے گا وہ
فصل پک جائے تو برفیلے شراروں کی سُلگتی آنچ میں آیرجؔ کبھی
تم کو اپنے جسم میں جلتے ہوئے دیکھے گا وہ

بولتے زخموں کے رُخ پر ڈوبتے منظر میں تھا
چیختی چنگھاڑتی خاموشیوں کا سرد جھونکا شام ہی سے گھر میں تھا
میں نے حرفوں کو پرو یا لفظ برتے
کچھ نہ کچھ کرتا رہا حالانکہ خود پتّھر میں تھا
وہ کہ ہر انداز میں پارہ صفت، گو آنچ دیتے نرم ہاتھوں کی رسائی میں نہیں
چاند میں رہتے ہوئے بھی کل مرے بستر میں تھا
سنگریزوں کی زباں برگشتہ تقدیروں کا ماتم
میرا دکھ صدیوں کی تنہائی کا نوحہ تیشۂ آذر میں تھا
بھاگتے لمحوں میں اپنے جسم کی پرچھائیوں کو اوڑھ کر سورج بجھا دینے سے پہلے رات پہنیں
اک عجب سودا ہمارے سر میں تھا
آسماں کی وسعتوں میں ایک کوندے کی طرح لپکا تو روشن ہو گیا
وہ کہ شاید اس سے پہلے مختلف شعبوں کی مُردہ ریتلی بنجر زمیں کے کھوکھلے دفتر میں تھا
تیری نظروں سے مری دیوارِ جاں ٹوٹی تو ایرج نے کہا
جاتے موسم میں اثر پت جھڑ کا ہر نشتر میں تھا

بُنتا رہوں گا شام سویرے نام سے تیرے آئندہ
اپنی غزل کے تانے بانے آئندہ
سوچ بکھرتے لمحوں کا سرمایہ ہے
اس پھیلاؤ کو میں نے سوچا اب کوئی سوچے آئندہ
لب ساقی، آنکھیں پیمانہ، رُخ درپن، پہلے خط میں میرے القاب
اور نہ جانے کیا کیا لکھے آئندہ
اب اپنی ہر چال سنبھل کر چلتا ہے
ڈر ہے وہ مجھ کو ہی سیدھی مات نہ دے دے آئندہ
فصلِ رسائی آتے آتے چھوڑ کے جاتا ہے مجھ کو
کس کو پڑی ہے اُس کو روکے آئندہ
اس بکھراؤ کا مطلب سوچنے والے سوچ، کِسے معلوم
ایسا وقت تجھے ہاتھ آئے آئندہ
وہ تو اس امید پہ [ایرج] کھیل رہا ہے دل شطرنج
اب تک ہارا شاید جیتے آئندہ

پھر دن رات اسی الجھن میں رہتا ہوں
کون ہے، میں جس کی آنکھوں میں جس کے من میں رہتا ہوں
اوس میں تاب، شفق میں لالی میرے ہی رنگوں سے ہے
لیکن کانٹوں کے دامن میں رہتا ہوں
میری کھوج فضول کہ میرا سایہ اور نہ پیکر رُوپ
خوشبو ہوں اور پھول بدن میں رہتا ہوں
رات فقیروں کا ڈھیرہ بیتی باتیں
دن کو دفتر یا فائلوں کے لال ربن میں رہتا ہوں
ارضِ غزل سے چُن چُن کر میں تحفے کیا کیا بھیج رہا ہوں
قید مگر الفاظ و معانی، صوت و صدا اور حرف و نوا کے سُونے درپن میں رہتا ہوں
بستی بستی ہجر کی راتیں، درد کی نا آسودہ ضد میں سانس محال
نہا آسودہ لمحوں کے دل آنگن میں رہتا ہوں
ـل تو بہت معمولی شئے ہے ایرج مجھ کو ڈھونڈ کہ میں
ہر اک لرزیدہ دھڑکن میں رہتا ہوں

میں بنجارہ میری حالت جانے کون
نگر نگر مارا مارا پھرتا ہوں کیونکر پوچھے کون
یاد سمندر، میں اور میری تنہائی
ایسے وحشت ناک مناظر میرا حصّہ، بانٹے کون
پھول نوشتہ، ساون خوشبو، تتلی رنگ
ان میں بھی ہے کوئی نسبت ابجھے کون
کس کو خبر ہے شام پرندہ کب لوٹا
افق اجالوں، شفق سویروں کے سنگم میں دیکھے کون
کھُلی کھُلی آنکھوں میں حیرت، نیند، خمار
کون پیے خوابوں کی مستی، سوئے کون
لفظ اذانوں کا جادو صحرا صحرا
کب پھیلا، کس سمت گیا، کس وقت کھُلا، بتلائے کون
روش روش کانٹے ہیں ایرج اور کانٹوں سے یاری ہے
پاؤں لہو لہو ہو جائیں اپنا رستہ بدلے کون

نَظمیں

اعتراف

سفر سراب سلسلے
سمندروں سمیت ساحلوں سے
سرسراتی سرپھری سبک
ہمکتی ہنہناتی ہانپتی ہوائیں
ریت نقش پھول آہٹیں
اُڑا کے لے گئے
نوشتہ میرے ہاتھ کے طلسم میں اسیر تھا
نوا نوا
نگاہِ نارسا، نویدِ ناشنیدہ کی شکار تھی
سکوت سرگذشت
سربریدہ سرسراہٹیں
سراغ

سرمئی
کہ
سرد ئی سماعتیں
ہمارے درمیاں نظر نہ آنے والے
فاصلے
جو
روشنی کے لاکھوں سال
اپنی
ناتواں تہوں میں
گھول کر اُتارنے کی سعیٔ میں
شش جہت میں گھُل گئے
زمیں سے آسمان تک
محیط ہیں
بسیط ہیں
سفر سراب سلسلے
وجود کی حدود سے
عدم کی وسعتیں لیے
رواں دواں مرے لیے

کہ
میں سراب منتشر
کہ
میں سفر قیام سے خرام تک
کہ
مجھ پہ سلسلوں کی سرحدیں حرام ہیں
میں
سمت ہوں
جیسے
سراب سلسلے
سفر کے سارے مرحلے
لہو حرارتوں کے درمیاں
کشاکشوں میں لے گئے
میں
لامکاں کی وسعتوں میں پھیلتا چلا گیا
مکیں ہوا تو حرف کا
میں
لفظ لفظ حادثہ

فسونِ چشمِ نارسا
ستارہ
شب کی گود میں
فلک کی انتہا لیے
فریبِ ذات میں مگن
کہ
کائنات کے سفر میں
سلسلہ
سراب کا
گجر
سنہرے خواب کا
صدا جرس کی
احتساب و اضطراب
اذنِ بے خودی
ہوا ہوا
شکستہ پر
لہو لہو —— رواں دواں
سفر سراب سلسلے

سوالیہ نشان ہیں
میں کون تھا
میں کون ہوں
میں تھا اگر
تو کس لیے
مرا وجود
میری بندشیں
کہاں کہاں
بھٹک رہی ہیں
آج تک
نہ سمت ہے نہ مسکنت
تو
پھر یہ دائروں میں دائروں کے درمیاں
میں
کس لیے صلیب پر ٹنگا رہا
میں
خاک ہوں
تو

کس لیے ستارے
میری عظمتوں میں ڈوب کر چمک اُٹھے
چاند
میری ذات کا، جہات کا
طلوع
اس طرح ہوا
آئینوں کی کہکشاں سے زینہ زینہ
روشنی
بکھیرتا چلا گیا
کہ
آفتاب کے جلو میں ضوفشاں
اُفق اُفق
مرے وجود میں سمیٹ کر بکھر گیا
سفر کی ابتدا ہوئی
سراب
چشمِ پارسا میں گم ہوئے
حیات
سلسلوں کی قید سے رہا ہوئی

ہیں
شش جہت پہ حکمراں ہوا
مگر
تمھاری سلطنت میں
بس
تمھاری عظمتوں کے اعتراف میں
ہزاروں
لاکھوں بار اپنا سر جھکا دیا
تمھاری ہی پناہ میں
تمام تر
روایتوں
حکایتوں کے درمیاں
میں
خود پہ منکشف ہوا ــــــ!

تیسری سوچ

یہ چاہتا ہوں
کسی چمکتے ہوئے ستارے کی دُم پکڑ کر
میں
شام کی الٹی سوچ سیڑھی پھلانگ کر
کہکشاں کی وسعت سمیٹ لوں
اپنے
تنگ دامن کی مانگ میں
اس طرح سجالوں
کہ
شب سمندر کی بپھری موجوں کے
رُخ سفینے پہ بیٹھ کر
جب

زمق زمق بحر و بر کے ابلھے سفر پہ نکلوں
تو
چاندنی بے قرار ہو کر
تھپک تھپک کر مجھے سُلا دے
یا
اپنی آغوش میں بٹھا دے
یا
اپنی پلکیں دراز کر کے
سفر کی ساری
تھکاوٹوں پر ہی
سایہ کر دے
یہ چاہتا ہوں
سحر کی پازیب سے اُبلتے
حسیں سویروں کے وا جھروکوں سے
نور
چُن چُن کے
شب کے چہرے کے زخم سی لوں
مسافتوں کا

میں
زہرِ قاتل خوشی سے پی لوں
سیاہ سورج کی ڈھیر ساری
تمازتوں کا حساب کرلوں
افق سے ہوتے ہوئے
افق تک
روپہلے بادل کی کاشت کرلوں
اگر یہ سب میرے بس میں ہوتا
میں جانتا ہوں
مگر مرے بس میں کچھ نہیں ہے
یہ سوچتا ہوں
میں آتما ہوں
بھٹک رہی ہو
جو
لاکھوں قرنوں ہزاروں برسوں سے
اپنے پچھلے جنم کے مومی وجود کے
بے نشاں
خمیدہ کھنڈر کی

دانستہ کھوج میں
بے جہت خلاء میں
مکاں سے گذرا تو لامکاں تک
فلک سے اترا
ستارہ ٹوٹا
مجھے
تو اکثر
گماں گذرتا ہے
میری بیوی بھی
میرے بچّے بھی
دوسرے
آشنا وجودوں کی طرح
میرے لیے
ازل سے ہی اجنبی ہیں
مگر
میں گوتم نہیں
کہ
اپنے لہو کی زندہ امانتوں کو

زمانے بھر کے
عمیق صحرا میں
دُھوپ
پانی
سراب
مٹی کے قید خانے میں
پابہ جولاں تڑپتا چھوڑوں
بنوں میں بھٹکوں
کہ
گیان پاؤں
میں
جانتا ہوں
کہ
گیان مجھ کو ملا ہے
مجھ کو
کہیں بھی پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں اُجاڑ دے گی
وہ
پیڑ برگد کے ہی نہ کیوں ہوں

مگر
میں اپنے لہو کی ساری
امانتوں کو
سفر کی منزل عطا کروں گا
مگر
سفر میں صعوبتیں ہیں
مرے لہو کی
امانتیں

یہ
صعوبتیں کب تلک
اٹھائیں
میں
سوچتا ہوں
نہ
تم نے سوچا۔

بازار

کچھ ایسا ہو
کہ
جذبوں کی صداقت میں اُتر کر تم دعا مانگو
کہ
تم کو پھر جوانی بھی ملے
حُسنِ سلیقہ بھی
پھر ایسا ہو
مجھے
نیلام میں
تم پھر خریدو
رُخِ زیبا کو میرے دیکھ کر ہی
مصر کی حوریں

جنھیں
دعوت میں اپنے ہاں بلاؤ تم
کتر لیں انگلیاں اپنی
کچھ ایسے
رونمائی میری ہو جائے
زلیخا تم نہیں ہو
تو
میں بھی
یوسفِ کنعاں نہیں ہوں
مگر
دونوں کے جذبے
ایک سے کیوں ہیں
بھلا ہم کون ہیں
اور ایسے
پھیلتے بازار میں
کیوں؟
ایک ہی جانب کھڑے ہیں
یہاں

کیوں آدمی نیلام ہوتے ہیں
مجھے
نیلام گھر کے سامنے لاکر
یہ آدم زاد حبشی، یہ سیہ صورت سیہ دل لوگ
کیوں
کوڑے لگاتے ہیں
میں بکنے کے لیے آیا نہیں ہوں
کہ
اس بازار میں
دام
اپنے لگواؤں تو کیونکر
یہاں تو یوسفِ کنعاں کی قیمت
سُوت کی اک گانٹھ سے زیادہ نہ لگ پائی
زلیخا
تم نہیں ہو
تو میں بھی یوسفِ کنعاں نہیں ہوں

واپسی

تمھاری
دنیا بہت حسیں ہے
کہا تھا اُس نے
میں
سانپ صورت
کسی بھی لمحے مگر نمودار ہوں گا اس میں
کہ
جب سے اب تک
میں چار جانب سے گِھر گیا ہوں
مجھے
کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے
کہ سرسراتے ہیں سانپ سارے مری زمیں پر

وہ
سانپ صورت مری زمیں میں چھپا نہ بھی ہو
مرے لہو میں اتر گیا ہے
کہ
میرا کاٹا نہ مانگے پانی
میں
ایسی جنّت کی کھوج میں ہوں
جو میری دنیا سے بھی حسیں ہو
مگر حقیقت ہے
کوئی جنّت حسیں نہیں ہے
مری زمیں سے
میں
اپنی دنیا میں لوٹ آتا
مگر
سُنا ہے
وہ اب سپیروں کی مملکت ہے۔

وراثت

مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑو
کہ
میں احساس کی ترسی ہوئی خواہش کے ہاتھوں کا
کھلونا ہوں
جسے
چابی اگر دی جائے
تو
بے ساختہ پرواز میں گُم ہو کے
خوابوں میں خلاؤں میں
کہ
سورج کی دِشاؤں میں، فضاؤں میں

نئے اسرار
الجھن کے نئے دروازے
تم لوگوں پہ
وا کر لے
مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑ دو
کہ
میں کوئی ستارہ ہوں
جو
ماتھے سے فلک کے ٹوٹ کر بکھرا
کہیں
سمتوں میں سمٹا
اور
کہیں بے سمتیوں کی گھور تاریکی کو
اپنی
آنچ دیتی ٹمٹماتی روشنی سے
ضو فشاں کر کے
کبھی

تو چاند کو نم چاندنی بخشی
کبھی
مریخ پر بستی بسا کر
کہکشاں کو
آنکھ جھپکائے بِنا دیکھا
مگر بے کار
منزل سے نئی منزل کی دُھن میں
راستوں کی اُلجھنوں میں
اس طرح اُلجھا
معلّق ہو گیا بارِ دگر نادیدہ محور پر
مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑو
کہ
میری بیکرانی
بجلیوں نے اپنی بے تابی میں
دوڑاتے ہوئے
افلاک سے
سُوئے زمیں

پہلا سفر طے کر کے
اپنی
بے وجودی کو
وجودِ لمس کے سانچے میں ڈھالا
رقص کرتے بے صدا لمحوں میں پہچانا
یہی
وہ وقت تھا
جب
فاصلوں کے زخم
بحر و بر کے سینے پر ہویدا ہو گئے تھے
مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑو
کہ
میں بے چہرگی منظر لیے
صدیوں سے
اپنی کھوج کے دشوار تر زینے سے اُترا ہوں
سبھی
بیساکھیاں میرے لیے ہیں

مگر
قامت کی میرے
کوئی
بیساکھی نہیں ہے
کہ
میں نے اپنی بغلوں میں دبا کر
آگے جانے کی
بہت
کوشش بھی کی ہے
ابھی تک
نامرادی مجھ پہ خنداں ہے
کہ
میں بے چہرگی کی بِھیڑ میں تنہا بھٹکتا ہوں
مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑو
کہ
میں بھی یوسفِ بے خانماں
بے کارواں ہوں

روایت سے علامت تک گراں ہوں

روایت!
لوگ جس کو پوجتے ہیں
علامت!!
لوگ جس کی کھوج میں ہیں
علامت کی روایت مختلف ہے!!!
سمجھ کا پھیر ہو
یا
لفظ کے بیچاک معنی ہوں
کسی
تجسیم کے خوگر نہیں
گُم گشتہ جنّت کو
مرے
شوقِ تجسّس کی کمندیں
چھُو چکی ہیں
مگر اس کا احاطہ کر نہیں پائیں
مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑو

کہ
مجھ کو داستانیں
حادثے
تتلی صدائیں، رنگ پیکر، لفظ خوشبو
آنکھ نشّہ، درد خنجر
پھول نغمہ، سوچ نشتر
آج بھی
اپنی طرف
جب سے بُلاتے ہیں
کہ

جب سے
صبح خواہش، دھوپ آنگن
شام آنچل، رات کروٹ
رُوپ دریا، دل سمندر
سوچ کے فوکس پہ
لرزاں ہیں
کہ
میں ہی مرکزی کردار ہوں ساری کہانی کا

مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑ دو
مجھے
معلوم ہے مجھ کو
مری ہرزہ سرائی
قیصر و کسریٰ کے درباری مشیروں میں
نمایاں کر کے سرافراز کرتی ہے
مجھے
یہ بھی خبر ہے
میں
تمھاری طے شدہ، بوسیدہ قدروں کے ضوابط سے
منافق ہوں
تمھاری
ناروا سچّائیوں کی رُو سے جھوٹا ہوں
تم
اپنے منہ چڑھے انصاف کی ناکارہ
پرتوں کو
کبھی

اک ایک کر کے غور سے پڑھ لو

ہر
اک صفحے کی پیشانی پہ میرا نام لکھا ہے

کہ

میں مقتول بھی ہوں

اور

قاتل بھی

گنہگاروں کا منصف بھی

اگر

میرے لیے

دس بیس کوڑوں کی سزا کم ہے

تم

اپنے شہر کا

قانون بدلو

مجھے

سنگسار کرنے کا

کسی

ایوان سے اعلان کر دو

مری
انکار کی سولی پہ
چڑھ
جانے سے پہلے
آخری خواہش یہی ہے
کبھی
تم لوگ
اپنے شہر کے
آتشکدوں میں
مسجدوں میں
مندروں میں
گردواروں میں
ندامت سے
جبینیں ٹیکنے کی سعیٔ نہ کرنا
کہ
ممکن ہے
مرے
نقشِ قدم کی

خوش بوئیں
تم لوگ
پہچانو
بڑا
قاتل ہے پچھتاوے کا لمحہ
مجھے
تم لوگ میرے حال پر چھوڑو
کہ
میں
لب سلسلہ کھولے ہوئے ہوں
مری
شعلہ نوائی میں
مرے
جذبوں کی ساری
رُوح
میرے غم کی
الجھی، ناچتی پرچھائیاں
صدموں کی چبھتی آہٹیں

محرمیوں کی چاپ
پت جھڑ کی سسکتی، سنناتی، چیختی، چنگھاڑتی
منہ زور آندھی کی ستم آرائیاں
گرتے ہوئے پتّوں کی خاموشی
اُفق کی دوریاں، ساغرِ شفق کی سُرخیاں
انکار سے اقرار کی
ایذا رسانی تک

مرے
سانسوں میں مدغم ہیں
مجھے
شامل کرو تم آخرِ شب کی دعاؤں میں
کہ
میں
اس کائناتِ کرب کا تنہا ہی وارث ہوں۔

کنفیوژن

خواب
اک خیال ہے
اُس نے
طنز سے کہا
مگر
اُسے بتائے
کون
خواب
لاشعور کی
نزاکتوں میں پلتے ہیں
خیال تو
شعور کی حرارتوں کا نام ہے

کبھی اگر
شعور و لاشعور کی
حرارتوں، نزاکتوں کے درمیاں
اٹھی ہوئی
توازنِ نشست ٹوٹ جائے
آدمی کا
پاگلوں میں ہوشمار
اور
میں یہ کیسے مان لوں
میں
کہ ہوشمند ہوں
خواب کو خیال سے ملائے
کوئی
کس طرح
کہ
آگہی تو نور ہے
خیال کا ظہور ہے — !!

بازگشت

اِن رشتوں کی بُھول بھلّیوں میں تم جانم
کھو مت جانا
یہ رشتے جانے بوجھے سوچے مانے ہیں
خون کے رشتے ہوں یا ہوں
جذباتی بندھن
بہنوں کی تقدیس کا رشتہ ہو یا پھر محبوب کا رشتہ
سب کے سب کچّے دھاگے ہیں
ان کی ساکھ تو
مطلب یا خود غرضی پر رکھی جاتی ہے
اور
کسی نازک لمحے میں
ٹوٹ ہی جاتے ہیں یہ رشتے ، پھوٹ ہی جاتے ہیں یہ رشتے

کیا
تم کو معلوم ہے جانم
کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں
جن کا کوئی نام نہیں ہے
جن کو سوچنا ناممکن ہے

جو
محسوس کیے جاتے ہیں
جیسے
بندے کا اپنے معبود سے رشتہ
میرا
ایسا ہی رشتہ ہے
تم سے جانم
جس کا کوئی نام نہیں ہے
جانے تم کب اس کو سمجھو
جانے
کب محسوس کرو تم !!

دائرے

کوئی ٹوٹے ہوئے کھلونوں میں
اپنے ماضی کو قید کر آیا
کوئی کاغذ کے پھول چُن چن کر
حال کی خوشنما فصیلوں میں اپنے زندہ لہو کی چھینٹوں سے
ایک عنوانِ دل تراش آیا
کوئی الجھی ہوئی لکیروں میں اپنے چہرے کو ڈھونڈتا ہوگا
(کل کوئی ہو نہ ہو خدا جانے)
وہ فسانہ سہی فریب سہی
یہ حقیقت ہے تلخ ہو شیریں
میں
ترے شہر کے چوراہے پر اپنے افکار بیچ آیا ہوں۔

گردِ باد

نیلی پیلی کاسنی نم
سرسراتی بجلیوں کی
لذّتوں کے سنناتے دائروں کا سلسلہ
پنہاں تو تھا
رقصاں ہوا تھا
جسم سے اٹھتی ہوئی آتش فشاں
خوشبو کے سائوں کی دھمک
خوں گشتہ ہونٹوں کی مہک
برفیلی سایہ دار زلفوں کی سلگتی آنچ میں
تپتی ہوئی خمدار آنکھوں کی چمک
بے جاں بھی تھی طوفاں بھی تھی
سربستہ ناول کے

حسین اوراق شاید کھلنے والے تھے
کہ
ناول سولہویں موسم کی
سیمابی تپش کے بوجھ سے
رس دار آموں کی لچکتی شاخ کی صورت جھکا ہی جارہا تھا
میں نے
اپنے موقلم سے ٹھوس ناول پر بندھا زردار، چمکیلا، سنہرا لال فیتہ
کاٹ کر آنکھوں پہ باندھا تھا
حسیں ناول کا
اک اک لفظ روشن ہوگیا مجھ پر
تو
میں نے گندمی الفاظ کو
چوما
کبھی چاٹا، سنوارا اور پھر نوچا
ہوا بھی مہرباں تھی
اس طرح
سیڑھی، ورنڈا، چھت، چٹائی، بالکونی کے
چھپے روشن اندھیروں کی

ٹھٹھرتی اوٹ میں
الفاظ کو میں نے پرویا
اور
ناول
بیسویں موسم کی سم آلود پت جھڑ کی نوکیلی زد میں آتے ہی
سمٹ کر منتشر ہونے لگا تھا
میں نے
اپنے موقلم سے گذرے منظر
وقت کے
کینوس پر عریاں اتارے
تیسویں موسم میں
ناول کو بھی گویائی ملی
اُس نے کہا
کیا !!
تم مرے بھائی نہیں ہو
آگ کی نہریں
مرے اندر
رواں تھیں

منجمد ہوتی گئیں
میں
خود بہ خود سمجھا
کہ
دیمک
کاغذوں کو کھا چکی ہے
اور ناول کا
کوئی حصّہ
کوئی بھی باب پڑھنے کے لیے
سیڑھی
ورنڈا، چھت، چٹائی، بالکونی کے
پیچھے
روشن اندھیروں کی
ٹھٹھرتی اوٹ
اب
موزوں نہیں ہے۔

اعتکاف

ہر طرف سڑکیں ہیں بکھری
اور
میں سڑکوں سے لپٹا
چارسو حرکت میں ہوں
لازم و ملزوم ہیں
میں اور سڑکیں
میں
کہ اپنے جسم کی بے چہرہ آنکھوں سے یہی کچھ دیکھتا ہوں
جیسے
میرا ہے نہیں کوئی وجود
بے سبب خائف ہیں مجھ سے راہرو
وہم کا

لقمان بھی کب کر سکا کوئی علاج
خوف میں منطق نہیں
لیکن
یہ سڑکیں کیوں سمٹتی جا رہی ہیں
ہُو کا عالم ہے
ٹھٹھرتے سائے
غاروں سے نکل کر
وادیوں میں دندناتے ہیں
نگر والے سمٹ آئے پہاڑوں کی طرف
سچ ہے
کہ اب بس میں کسی کے بھی نہیں
سمتوں کا رُوپ
آگ کا گولا چھُپا بیٹھا ہے جانے کس طرف
کس طرف مشرق ہے اب کیسے کہیں
اب تو
بے سمتی ہمارا ہی مقدّر ہو چکی ہے !

پھانس

ابھی
شہنشاہِ سامری نے فُسون اپنا پڑھا نہیں تھا
ابھی تو مجمع بھی داستانیں بڑے سکوں سے
بڑی خموشی سے
سُن رہا تھا
کہ
داستاں گو پلٹ پڑا تھا کسی کی جانب
مگر
میں پتّھر کا ہو گیا تھا
ابھی تو
پنجرے میں قید تھا وہ پری صفت باکمال طوطا
کہ

جانِ عالم نے جس کو پالا
یہ سچ ہے عمرو نے اپنے چہرے پہ اور چہرے چڑھا لیے تھے
مجھے زنبیلِ ستم میں ڈالا
کہ خود گلیم ہوا میں چھپ کر
تلاش میں پھر اسد کی نکلا
کہ پاس جس کے تھیں اسمِ اعظم کی چابیاں سب

وہ
ساتویں در کے سامنے
مجھ کو
نصب کر کے چلا گیا تھا
جہاں میں اب تک رکھا ہوا ہوں
یہاں سبھی آنے جانے والے مری عبادت سے مطمئن ہیں
میں
خوش نہیں ہوں
کہ
اسمِ اعظم کی پھانس اٹکی ہوئی ہے اب تک مرے گلے میں۔

ہوا دشت دیار

ہوائے سنگ پھر چلی
شجر شجر
شکستہ بام و در لرز اُٹھے
ہوائے سنگ پھر چلی
شجر شجر اکھڑ گئے
شکستہ بام و در اُجڑ گئے

کہ

پھر چلی ہوائے سنگ ، پھر چلی
مرے وجود کی حدود کو مگر نہ چھُو سکی
مری جڑیں
جو کھوکھلے خلاء سے میری ذات کی تہوں میں جذب تھیں
کچھ اور پھیلنے لگیں

زمیں کی چھاتیوں سے خون چُوسنے لگیں
ہوائے سنگ
تیز تر!
مجھ کو سنگسار کر
مجھ کو
میرے اَن کیے گناہوں کی سزا تو دے
مجھ کو
میری بے گناہیاں بہت عزیز ہیں
میں زمہریرِ ذات میں ہی دفن ہوں
ہوائے سنگ
تیز گام تیز تر
ہمارے درمیاں ابھی وجود کا ہے فاصلہ
یہ فاصلہ اکھاڑ پھینک
مجھ میں موتیوں کو ڈھونڈ
سِیپیاں تلاش کر
میں
ریت ریت بیکراں سمندروں کی تھاہ ہوں
پناہ ہوں

جھلستی دھوپ کے سفر حصار کی اساس ہوں
دشت دشت پیاس ہوں
پیاس بے قیاس ہوں
قیاس اقتباس ہوں
اداس ہوں
کربلائے زیست میں اکیلا بدحواس ہوں
میں
ہاتھ اپنا دوں تو کس کے ہاتھ میں
کس کو رہنما کروں
کون ہے
جو میری رہبری کرے
بس ایک بار مجھ کو میری ذات سے رہا کرے
کہ
آج تک ہوس ہوس اسیر ہوں
قطرہ قطرہ، بوند بوند
فق
لہو میں تر بتر
علامتوں

سلگتی بے ثباتیوں کے درمیاں
کشاں کشاں
مگر
میں اس کا کیا کروں ہوائے سنگ
میرے منہ کو آدمی کے گرم خوں کا ذائقہ عزیز ہے
اگرچہ کائنات کا ہوں جزوِ کُل
ہوائے سنگ
میں گناہ گار ہوں
مگر عجیب
مجھ پہ دوزخوں کی آگ تک حرام ہے
میں
مغفرت کا بھی نہیں ہوں مستحق
ہوائے سنگ
تیز گام تیز تر
مجھ کو
میری سب اکائیوں سمیت ہی اکھاڑ دے۔

اِنفصال

تمھاری
پلکوں پہ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی
کہکشاں کو
میں
اپنے دامن میں جذب کر کے
سراب ظلمت کے تنگ ماتھے کی سلوٹوں میں
کہ
بحر و بر پر
کسی کنارے، کسی گپھا یا کسی پہاڑی پہ حکمراں ہو
سجا سجا کر
ہر ایک
ٹھٹھری سیاہ ساعت میں نور بھر دوں

یہ حوصلہ دو
تمھاری زلفوں کی برف قامت سبک لکیریں
حنا کشیدہ
مہک سے دھو کر
سیہ
روپہلی گھٹاؤں کی نارسائیوں کی
فریب زا
بے زبان چادر
میں
اپنے پاؤں سے اپنے سر تک
پہن کے دیکھوں
کہ
زخم خود سے چھپا سکوں میں
تمھارے
ماتھے کے چاند جھومر کا
طوق
اپنی کٹی ہوئی بے نشان گردن میں
پھر سے پہنوں

یہ آرزو ہے
تمہارا چہرہ
شفق سویروں
افق اُجالوں کی ہو علامت
تمہارے
مخمل صفت لبوں کی
شراب خواہش
مری
رگ وپے میں
آتشیں ارتعاش صورت
کبھی تو دہکے
کبھی تو مہکے شباب بن کر
تمہارے
سانسوں کو
دن کی
ساری تمازتوں میں
گذیدہ شب کی حرارتوں میں
مسافتوں میں

سفر کے ہر ہر قدم پہ برتوں
مجھے
اجازت ملے
تمھارے
بدن سے مرمر تراش کر
میں
سُلگتے پیکر کو
چاندنی کا وجود بخشوں
کسی
اماوس کی شب میں
اپنے
چہار جانب اجالا کر لوں
شگفتگی
سایہ سایہ مہکوں
غبار اوڑھوں
سراب سوچوں
میں
اپنی خواہش کی تتلیوں کے لباس چھینوں

مجھے
دعا دو
کہ
میں تمھاری ہی جستجو میں
سراب
پانی
پہاڑ
مٹی
بھی کھود ڈالوں
مجھے
سزا دو
کہ
میں
بریدہ بدن لیے انتظار میں ہوں۔

اِنتظار

نشستِ جاں سے اُٹھے گی جو آندھی
فصیلیں جسم کی
ساری کی ساری
توڑ کر نکلے
پسِ منظر سے لے کر
پیس منظر تک ہیں
جتنے بھی مناظر
عکس بن کر
چشمِ باطل میں اُگ آئیں
کہ
سارے جسم فرسودہ ہوئے ہیں
مگر

میں نے
کسی بھی جسم کی دیوار
کائی کی طرح پھٹتی نہیں دیکھی
کچھ ایسا ہو
مری آنکھوں کو جتنے زخم
پیچیدہ سرابوں نے دیئے ہیں
مناظر میں سمٹ آئیں
کہ
آندھی
اب نشستِ جاں سے اُٹھتی ہے
تمھارے شہر کے اطراف میں پھیلے
تو
ہر گز تم نہ ڈر کر
ذات کے محبس میں چھُپ جانا

یہ
آندھی تو ہمارے درمیاں
اک حدِ فاصل ہے
دلوں کے فاصلے سمٹیں

یہ

آندھی خود بخود شعلوں پہ لپکے گی

تم

اب تک منتظر کیوں ہو

کہ

اب تو معجزے ہوتے نہیں ہیں

نشستِ جاں سے

کب

اُٹھے گی آندھی

کہ

ہم تو جسم کی دہلیز پر

صدیوں سے

اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہیں

کسی صورت

یہ

جسموں کی فصیلیں توڑ کر نکلے ۔

ھونی

اور
پھر اُس رات
اُس آدھے ادھورے آدمی نے
میری مُردہ کوکھ میں
کچھ پھول چھرے
چاند جھُومر بو دیئے تھے
جن کی خوشبو
اور
جن کی دھوپ آہٹ کا ہے
اب تک
شہر کے قاضی کا فتویٰ منتظر ——!!

تب بھی

آج بھی میں
روشنی کے ہاتھ سے
ہر پا شکستہ ، تن برید ہ
گھپ اندھیرے کی سیاہی چیرتا ہوں
اور تب بھی
آج تک اپنی ہی آنکھوں کے
اندھیروں میں
حصارِ ذات میں
فرسودہ ہوں ، پژمُردہ ہوں
شاید یہی میں اور میری زندگی ہے ۔

غالبؔ کے طرفدار نہیں

○ میں خوش ہوں کہ مظفّر ایرج نے اُردو کو اظہار کا ذریعہ کامیابی سے بنایا ہے اور سخت نامساعد حالات میں اپنا چراغ جلایا ہے۔ میں نے ان کی شاعری کو جستہ جستہ پڑھا ہے اور پسند کیا ہے۔

وزیر آغا (سرگودھا)

○ نظم اور غزل دونوں میں مظفّر ایرج نے انفرادیت سے کام لیا ہے اور اپنے لہجے کی شناخت کو طمانیت بخشی ہے۔

شمس الرّحمٰن فاروقی (دھلی)

○ مظفّر ایرج کا کلام رسائل میں پڑھتا رہا ہوں اور سراہتا رہا ہوں۔ لیکن پیوستہ طور پر ان کے کلام کے مطالعے کے بعد پہلی بار اندازہ ہوا کہ انھوں نے توحید پرستی کو فنکاری کے جذباتی آبشار کی تہوں میں اتار دیا ہے۔ ان کا کلام بڑے ہی البیلے انداز میں متاثر کرتا ہے۔ میں اسے بار بار پڑھتا ہوں اور ہر بار متاثر ہوتا ہوں۔

ابنِ فرید (علی گڑھ)

○ مظفّر ایرج اس بے یقینی کو عریاں کر رہے ہیں جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔ ان کا غیر جذباتی انداز اس بے یقینی کو مجسّم کر ڈالتا ہے۔ ان کی غزل سے شاید پہلی دفعہ مخبری کا تصوّر اُبھرا ہے۔

انور سدید (لاھور)

○ غزلوں سے زیادہ مظفّر ایرج کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ جدید روایت زدگی سے کسی قدر الگ محسوس کر کے ان کے ہاں جس کھلے پن کا احساس ہوا اس کا ذائقہ دیر تک مخصوص رہا۔ شاعری کی بھیڑ میں ان کے کلام کی اپنی شخصیت ہے اور یہ کوئی کم بات نہیں۔

نشتر خانقاھی (بجنور)

○ مظفّر ایرج کے یہاں لفظی اور معنوی دونوں سطحوں پر جو فنکارانہ اظہار ہوتا ہے۔ وہ قابلِ ستائش ہے اور کسی بھی درسی یا مکتبی تنقید کا محتاج نہیں۔

مصوّر سبزواری (گڑگاؤں)

○ مظفّر ایرج بہ یک وقت دونوں دنیاؤں کا شاعر ہے۔ ایک کے راز تو وہ جانتا ہے اور دوسری میں نقب لگانے کی کوشش میں ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری انسان کو اس کی سبھی سطحوں پر متاثر کرتی ہے، اس لیے یہ شاعری مجھے پسند ہے۔

پریم کمار نظر (ھوشیارپور)

○ مظفّر ایرج کی تخلیقات میں جہان بھر کی واردات و کیفیات پر ان کا ردِّ عمل، ان کی سوچ اور اظہار کے لیے ان کا اپنا انداز مجھے بہت بھاتا ہے۔ غزلوں کے مقابلے میں نظمیں زیادہ پسند آتی ہیں کہ وہ اپنے موضوعات کا پورا پورا حق ادا کرتی ہیں اور بھرپور بھی ہوتی ہیں۔

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

○ اُمّی نبیؐ کے ماننے والے اُم الکتاب کے قاری مظفّر ایرج ان فضولیات اور لغویات کے شکار نہیں ہیں جنھیں اہلِ کم ہی علم کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایمانیت کی جو خوشبو رچی بسی ہے، وہ مجھے بے چین کرتی ہے۔ از کجا می آید ایں آوازِ دوست کا ترنم بڑھ کر میرے شانے تھام لیتا ہے۔

مسعود منوّر (دھلی)

○ مظفّر ایرج کے لہجے کے استحکام، اظہار کے وسیلوں پر قدرت، استعارات و تلمیحات کا فنکارانہ استعمال اور موضوع

کی ندرت کے ساتھ ساتھ موضوع تک رسد کے تازہ و شگفتہ زاویے سب مل کر ان کی شاعری کو ایک منفرد درجہ عطا کرتے ہیں اور ان کی آواز کو جدید شاعروں کی آواز میں ایک جداگانہ اور اہم مقام دیتے ہیں۔

آزاد گلاٹی (نابھہ)

○ مظفّر ایرج کی نظمیں ہمیشہ سے میرے لیے باعثِ کشش رہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ نظموں میں ان کی انفرادیت کُھل کر سامنے آتی ہے۔ اُردو کے جدید شاعروں میں نظم کے شاعر گنتی کے ہیں جنھیں انگلیوں پر گِنا جاتا ہے۔ اور ایک نظم گو کی حیثیت سے ایرج اس صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی کاوشیں اُردو ادب میں اضافے کا باعث بن سکتی ہیں۔

سُلطان شاھد (مالیگاؤں)

○ مظفّر ایرج کی غزل ہو یا نظم، مجھے متاثر کرتی ہے اور ان کی شاعری کے بارے میں میری رائے ہمیشہ سے اچھی رہی ہے۔

مظفّر حنفی (دھلی)

○ مظفّر ایرج کی شاعری جدیدیت اور تصوّف کا امتزاج ہے۔

سعید شباب (پاکستان)

○ مظفّر ایرج کی شاعرانہ قد و قامت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

اسعد بدایونی (علی گڑھ)

○ یہ امرِ عین حقیقت ہے کہ مظفّر ایرج کا میدان نظم ہے مگر غزلوں میں بھی ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔ ایرج ایک زخم خوردہ لہو رنگ وجود رکھتے ہیں جس کے اندر ایک تڑپتی سسکتی روح صرف اس لیے موجود ہے کہ خدا ایک نہ ایک دن اس کے شاعر کو اپنی رحمتوں سے ضرور نوازے گا۔ ان کے ہاں نظموں اور غزلوں میں ایک جداگانہ اندازِ احساس ملتا ہے اور مضامین بھی اکثر اچھوتے اور نئے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں یاسیّت اپنے عروج پر پہنچتے پہنچتے اُمید کے چاند کی کرنوں کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ سرزمینِ کشمیر کی مٹی کی خوشبو پڑھنے والے کے سادہ اور بے رنگ احساس کے کینواس پر اُن کے اشعار کی صورت میں ہزاروں خوش نما رنگوں کے دلکش منظر اُتارتی ہے۔

پروین کمار اشک (پٹھانکوٹ)

○ مظفّر ایرج کی شاعری میں تہ داری اور دلپذیری کی جو علامتیں موجود ہیں وہ ان کے گہرے سوچ و فکر کی غماز ہیں۔ خود شناسی اور "میں" کی راست گفتگو منفی روش کی نہیں، مثبت رویہ کی پہچان ہے۔

ساحل احمد (الہ آباد)

○ مظفّر ایرج کی شاعری کا انداز اور ان کے لہجے کی خوشبو مجھے ان کی شاعری کا دیوانہ بنائے ہوئے ہے۔

سرور عثمانی (بہار)

○ نظموں غزلوں کے تخلیقی دھنک رنگ احساسِ افق پر خوبصورتی سے بکھرتے ہوئے ایرج کی شعری کائنات کے دبیز ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ حواس کا داخلی اور خارجی رابطہ تجربوں، تجزیوں اور مشاہدوں کے ذریعے جو تناسب بناتا ہے اس میں منفرد ہو جانے کا شعوری عمل نمایاں ہے لیکن عصری شعری رویّوں کی تقلید، انحراف اور انفرادیت کی کوششیں، مجرد تراکیب اور علامتوں کے ذریعے سے نئے تخلیقی ذائقوں کا احساس بھی دیتی ہیں۔ تقلید انحراف اور انفرادیت کی کشمکش میں مواد، اظہار، لہجہ اور اسلوب روشن تو ہوتے ہیں تاہم ایرج کی سلیقہ مندی یہ ہے کہ انھوں نے نئی لفظیات یا الفاظ کی شکست و ریخت کے بجائے علامتوں اور

استعاروں کے باہمی ارتباط سے نئے مگر متحرک پیکروں کو اچھالنے کی سعی کی ہے۔ یہ کوشش لسانی سطح پر بھی ہے اور معانیاتی سطح پر بھی۔ بعض مقامات پر دُہرے استعارے تازہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ نئے نئے پیکروں کی تشکیل لفظ و معانی کو نیا اسلوب بھی دے دیتی ہے اور وسعت بھی۔ ان کی نظموں میں جو اساطیری فضا بکھری ہوئی ہے ان تضادات کا ردِ عمل ہے جو انسان اور کائنات کے درمیان صدیوں سے بنے ہوئے ہیں۔ ذاتی مسائل اور الجھنوں کو اجتماعیت سے علیحدہ کرکے دیکھنا اور خود کو گم کرتے ہوئے نہ روک پانا۔ کسی اعتماد و ایقان کو بنیاد بنا دینا ایک مخصوص ذہنی ساخت میں دنیا کو سمو دینا مظفر ایرج کی شاعری سے نمایاں ہے۔

(افتخار امام صدیقی (بمبئی)

○ مظفّر ایرج نے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو اپنے منفرد انداز میں نظموں اور غزلوں میں برتا ہے۔ زندگی اور سماج کے تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے حوالوں میں اپنی شناخت تلاش کرتے ہوئے آج کی زندگی کے اس کرب کو عریاں کیا ہے جو تنہا ان کا کرب نہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری دلوں کو چھوتی ہے اور اپنا دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ مظفّر ایرج کی نظموں میں اساطیری رنگ نمایاں ہے۔ لیکن وہ ان اساطیر کو آج کی زندگی اور حالات سے منسلک کرنے کی سعی کرتے ہیں اور ان کی غزلوں میں بھی یہی رنگ ملتا ہے۔ ایرج کو نظم اور غزل پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان میں تشبیہات، استعارات اور علامتیں آج کی زندگی کے حوالوں سے آئی ہیں، اس لیے ان میں تازگی اور کشش ہے۔

شمیم نکہت (دہلی)

○ خود کلامی کی تکنیک مظفّر ایرج کی شاعری میں ایک داخلی رو کی صورت میں موجود ہے جو اس کی شاعری کے شیرازے کو بکھرنے نہیں دیتی۔ شاید اس لیے کہ ان کی شاعری میں زندگی کی کشمکش کا عکس ابھرتا ہے۔ اور کشمکش کے اس عکس کا نظارہ وہ ساحل پر کھڑے ہو کر نہیں کرتے بلکہ خود متلاطم موجوں سے دوچار ہوتے ہوئے اس جد و جہد کی سچی تصویر سے روشناس ہوجاتے ہیں جو حالات سے لڑنے کی شہ دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کا عنصر نمایاں ہے کہ وہ مسائلِ حیات و کائنات پر مسلسل غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زندگی کے کھوئے ہوئے توازن کو حاصل کرنے اور اپنے وجود کو محسوس کرنے کے لیے خدا اور پُرانی قدروں کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ یہ عمل انکشاف ذات کے لیے بھی راہیں کھول دے گا۔ ان کی شاعری میں نئی لفظیات اور کائناتی آہنگ سے وابستہ پیکریت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ قوّتِ مشاہدہ، عصری حسّیت، تمام مظاہر کو سیّال بنانے کا عمل اور فن کی نامیاتی سطح ان کے امکانات کو روشن بنانے میں مددگار رہیں۔

حمید سہروردی (بیٹر)



محمد مظفر نقشبندی — ایرج

پیدائش: یکم اگست ۱۹۴۴ء بمقام سرینگر

ابتدائی تعلیم اسلامی درسگاہ صفاکدل، سرینگر۔ اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک اور ایس۔ پی۔ کالج سے ایف۔ ایس۔ سی کیا۔ بنارس سے ہینڈلوم ٹیکنالوجی میں ڈپلوما حاصل کیا۔ اور ۱۹۶۸ء میں وقتی طور سے ایک نیم سرکاری ملازمت اختیار کی۔ پھر Bussiness Management کا گریجویشن کورس کیا۔ آج کل جموں و کشمیر ہینڈلوم ڈیولپمنٹ کارپوریشن میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس ادب کی دنیا میں آئے۔ شروع میں ایرج کشمیری کے نام سے افسانے لکھے جو ملک کے اہم ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن طبیعت کی بے چینی نے اظہار کی کچھ اور وسعت چاہی۔ احساسات نے لطیف اور زیادہ بامعنی اظہار کی طرف مائل کیا۔ اور طبیعت غزل گوئی پر آمادہ ہوئی۔ غزلوں میں کلاسیکی اور جدید حسیات کی پاسداری کرتے کرتے جدید نظم اور غزل کے زیادہ جدید لہجے کے قریب آئے۔ مزاج کی یہ تبدیلی نام نہاد فیشن پرستی کے تحت نہیں، بلکہ ذہنی اور روحانی تجربات کی دین تھی۔

۱۹۸۳ء میں پہلا شعری مجموعہ "ابجد" شائع ہوا۔ مظفر ایرج آج کل کشمیری حسن اور معصومیت کی ایک دلفریب داستان کو مثنوی کا پیراہن عطا کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ دوستوں کے اصرار پر کشمیری زبان میں شاعری کا مجموعہ بھی ترتیب دے رہے ہیں۔